جناب شیخ عبدالرحمٰن صاحب

قرآن کریم میں سجع
اور
فواصل کا تناسب

نظم وترتیب کے لحاظ سے کلام کی تین قسمیں ہیں۔ شعر، سجع اور کلام مرسل بالفاظ دیگر کلام کی اپنے نظم کے اعتبار سے دو اساسی قسمیں ہیں: شعر اور نثر، پھر نثر کی دو قسمیں ہیں: سجع اور کلام مرسل۔

شعر نثر سے (مع اس کی دونوں ذیلی قسموں کے) اپنے خاص اوزان، اپنی بحروں اور اپنی معروف تفاعیل کے ذریعہ ممتاز ہوتا ہے۔ رہا سجع تو وہ اپنی قافیہ بندی کی وجہ سے نثر غیر مسجع سے منفرد ہے، مقفیٰ اور مسجع کلام کا اپنا ایک مستقل وجود ہے جو شعر سے مختلف ہے کیوں کہ شعر کے ترکیبی اجزاء اور لوازمات اس کی راہ میں آڑے آتے ہیں اور یہ ترکیبی اجزاء وہ اوزان اور معروف بحریں ہیں جن کے اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

مسجع کلام کی قافیہ بندی شعر کی قافیہ بندی سے مشابہ ہوتی ہے ایک شعر کے مقابلہ میں اس میں کمی یہ ہوتی ہے کہ یہ وزن کا پابند نہیں ہوتا۔ رہا غیر مسجع کلام مسجع تو وہ وزن اور قافیہ بندی دونوں ہی سے آزاد ہوتا ہے

قرآن کریم ایک عربی کلام ہے جو اُن انواع کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن اُن تمام ہی انواع سے یکسر خالی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اُن انواع میں سے قرآن کریم کے اسلوب کا تعلق کس نوع سے ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم شعر نہیں ہے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ اس کے کسی جزو کو شعر سے تعبیر کیا جائے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ کہنا بھی درست نہیں کہ قرآن کریم قافیہ بندی سے یکسر خالی ہے۔ اور اس کے اندر نثر مسجع کی جھلک بھی نہیں۔ کیوں کہ اگر یہ مان لیا جائے تو اُن بے شمار آیتوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو مختلف چھوٹی بڑی سورتوں میں پائی جاتی ہیں اور متناسب فواصل پر ختم ہوتی ہیں اور سجع کی قافیہ بندی سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں؟

چنانچہ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن نہ تو شعر ہے اور نہ ہی اس میں شعر کے وزن پر کوئی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح اس بات میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ قرآن کی بیشتر سورتیں ایسی آیات پر مشتمل ہیں جن میں مکمل طور پر یا ان کے بیشتر حصہ میں فواصل کی مناسبت پائی جاتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سوائے

ان سورتوں اور آیات کے جن کے فواصل باہم دگر مناسب ہیں قرآن مجید کا عام اسلوب کلام مرسل ہے

قرآن کے فواصل بعض مقامات پر تو ایک ہی نوع کے ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر مختلف انواع پر مشتمل ہوتے ہیں ۔

۱۔ مثال کے طور پر سورۃ "الضحیٰ" (وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۔ مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى) جو مختصر سورتوں میں سے ہے اور جس کی بیشتر آیات "الف" کے فاصلہ پر مبنی ہیں ۔

۲۔ اسی طرح سورہ "طٰہٰ" جو کہ طوال و قصار کے مابین ہے اس کی اکثر آیات فاصلہ الف پر ختم ہوتی ہیں (طٰهٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۔ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۔ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى)

اسی سورہ کا ایک ٹکڑا ہے (اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۔ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى)

اور کبھی آیات کا کوئی مجموعہ عمومی فاصلہ سے ہٹ کر کسی دوسرے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسا کہ اسی سورۃ "طٰہٰ" میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ وَيَسِّرْ لِىْٓ اَمْرِىْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ ۔ وَاجْعَلْ لِّىْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِىْ هٰرُوْنَ اَخِى ۔ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِىْ وَاَشْرِكْهُ فِىْٓ اَمْرِىْ)

ان مذکورہ بالا آیات کے فوراً بعد تین آیات کا ایک قصیر مجموعہ ایک ایسے فاصلہ پر ختم کیا گیا ہے جو پہلے دونوں مجموعہ آیات کے فاصلہ سے بالکل جدا ہے ۔ ارشاد باری ہے ۔ (كَىْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۔ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۔ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا)

پھر سورہ اپنے عام فاصلہ (فاصلہ الف) کی طرف پلٹ آتی ہے ۔

۳۔ ایسے ہی سورہ "النجم" کی آیات عام طور پر فاصلہ الف پر مبنی ہیں: (وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۔ ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى)

اور یہی سلسلہ سورہ کے اختتام کے ذرا پہلے تک چلتا ہے۔ اس کے بعد دو آیتوں کا ایک مجموعہ ایک نیا فاصلہ اختیار کر جاتا ہے، ارشاد باری ہے۔ (أزفت الآزفة، ليس لها من دون الله كاشفة) پھر اس کے بعد تیسرا مجموعہ ایک تیسرے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے۔ (افمن هذا الحديث تعجبون وتضحكون ولا تبكون، وانتم سامدون)۔

۴۔ یہی اسلوب سورہ مریم، الفرقان، الصافات، الملک، القلم، الحاقۃ، التکویر اور الانشقاق اور دیگر بہت ساری سورتوں میں ہے۔

۵۔ لیکن قرآن کریم میں کچھ سورتیں ایسی بھی ہیں جو از اوّل تا آخر ایک ہی فاصلہ پر مبنی ہیں مثال کے طور پر۔

(الف) سورہ "الشمس" (والشمس وضحاها۔ والقمر إذا تلاها۔ والنهار إذا جلّاها والليل إذا يغشاها۔ والسماء وما بناها۔ والارض وما طحاها) یہی طرز سورۃ کے اختتام تک باقی ہے۔

(ب) سورت "اللیل": (والليل إذا يغشى۔ والنهار اذا تجلّى۔ وما خلق الذكر والانثى إنّ سعيكم لشتّى)

(ج) اور بالکل یہی اسلوب سورہ قمر میں ہے جو ان دونوں مذکورہ سورتوں سے بڑی ہے۔ (اقتربت الساعة وانشق القمر۔ وإن يروا اية يعرضوا ويقولوا سحر مستمرّ۔ وكذبوا واتبعوا اهواهم وكل أمر مستقرّ۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا مثالیں نہ تو شعر کے قبیل سے ہیں اور نہ ہی وہ نثر مرسل سے تعلق رکھتی ہیں جو قافیہ اور تناسب فواصل کی رعایت کے بغیر لکھی گئی ہوں چنانچہ سوائے نثر مسجع کے اور کوئی قسم باقی نہ رہی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سجع نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس باب میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محققین کی رائے میں وہ آیات اور سورتیں جن میں فواصل کی مناسبت ہے وہ بعینہٖ اپنے معنی اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے سجع ہیں اور وہ اس میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک کلام بہر صورت متذکرہ بالا تینوں انواع ہی میں محصور ہے۔ مگر علماء کے دوسرے گروہ کی رائے میں قرآن کو سجع کہنا درست نہیں ہے۔ لیکن آخر کیوں؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سجع کی حقیقت و ماہیت باہم متناسب فواصل پر منطبق ہونے سے ابا کرتی ہے۔ (جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثالوں میں بعض سور اور آیات کو بطور مثال پیش کیا) اور وہ حقیقت کیا ہے جو ان فواصل پر منطبق نہیں ہوتی ہے؟ جو لوگ قرآن میں سجع کے قائل نہیں ہیں انہوں نے وجہ مخالفت کو تشفی بخش انداز میں پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس نقطہ کا تعین کیا جہاں پہونچ کر سجع قرآن

پُر تکلف ہوتا یا محض کہانت میں مستعمل ہوتا ہے۔

اگر ایسے شعراء و ادباء کے مسجع کلام کا جائزہ لیا جائے جو سجع سے شغف رکھتے ہیں اور اس میں حد سے تجاوز کرتے ہیں تو عام طور پر صورت حال یہ ہوتی ہے کہ وہ تکلف سے پر ہوتا ہے جس میں معنی کے مقابلہ میں لفظ پر زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے کلام معنوی اعتبار سے بے جان ہو کر رہ جاتا ہے اور ایسے چھلکے کے مانند ہو جاتا ہے جو مغز سے خالی ہو۔ ایسی صورت میں سجع بلاشبہ قابل مذمت اور معیوب ہے، اور جب اس پہلو سے سجع پر غور کیا جائے تو یہ کہنا مناسب ہے کہ لفظ سجع (جو عیب و ذم پر دلالت کرتا ہے) کا اطلاق قرآن کریم کے متناسب فواصل پر کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

لفظ سجع کا اطلاق قرآنی فواصل پر کرنے سے اس وجہ سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے کہ اس کلمہ کا زیادہ تر اطلاق کہانت میں مستعمل اس سجع پر ہوتا ہے جو کہ دجل و فریب کا مرقع ہے۔ یہی وہ سبب ہے جو ہمارے نزدیک لفظ سجع کا اطلاق قرآن کے فواصل پر کرنے میں مانع ہے۔ ورنہ کسی کلام کا متناسب فواصل کے ساتھ ہونا جس پر کہ کلمہ سجع دلالت کرتا ہے بذاتِ خود معیوب نہیں ہے کیوں کہ قرآن میں فواصل کا تناسب ایک امر واقعہ ہے اور بہت کثرت سے بیشتر مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ سجع میں باقلانی کا موقف

قاضی ابوبکر باقلانی قرآن کریم میں سجع کے وقوع کا انکار کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ اپنے مخالفین پر اس شدت سے انکار کرتے ہیں کہ قرآنی فواصل میں سجع کا واقع ہونا بہت ہی مشہور و معروف ہے، ان کی رائے میں بذاتِ خود ان فواصل کا تناسب مقصود نہیں۔ چنانچہ وہ "اعجاز القرآن" میں رقم طراز ہیں کہ: دراصل ان فواصل کا مقصود قرآنی اعجاز کے بہت سارے پہلوؤں میں سے ایک پہلو کو اجاگر کرنا ہے وہ اس طرح کہ ایک ہی قسم معنی اور نظم کی قوت اور اسلوب کی چاشنی و لطافت کے ساتھ مختلف اسالیب و پیرایوں میں اس طرح بیان کیا جائے کہ جملہ کے بعض اجزاء کو کہیں مقدم اور کہیں موخر کر دیا جائے۔ یہ زبان پر قدرت کی دلیل اور بلاغت و براعت کی واضح علامت ہے

اسی طرح امام سیوطی "الاتقان" میں اس کو نقل کرتے ہیں اور اسی دلیل سے قرآن کریم میں سجع کے مویدین کی تردید کرتے ہیں۔ کیونکہ مویدینِ سجع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ: موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں ہارون علیہ السلام کو بعض مقامات پر مقدم کیا گیا ہے جب کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے افضل ہیں اور جب ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے تو اصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر مقدم ہو لیکن سجع کا لحاظ کرتے ہوئے بعض آیات میں ہارون علیہ السلام کو ان پر مقدم کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے (فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا

مندرجہ بالا پانچوں امور میں سے پہلے تین کے مابین کوئی ایسا قابل ذکر فرق نہیں ہے جس کی وجہ سے کلام سجع اور فواصل آیات کے درمیان فرق کیا جا سکے، کیوں کہ بعض قرآنی آیات جن کے متناسب فواصل آیات کے مختصر ہونے کی بنا پر اسی طرح متقارب ہوتے ہیں جیسا کہ سجع کے بیان میں گذر چکا ہے ۔

اور بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک مجموعہ ایک فاصلہ پر ہوتا ہے پھر اس کے بعد والا مجموعہ ایک دوسرے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات تیسرا مجموعہ ایک تیسرے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسا کہ مسجع کلام میں ہوتا ہے ۔

البتہ آخری دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ سجع اور فواصل آیات کے درمیان فرق کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ فواصل (آیاتِ قرآنی کے فواصل) اُن اسباب سے خالی ہیں جن سے مسجع کلام کی مذمت کا پہلو نکلتا ہے ۔ پھر یہ بھی کہ وہ اسباب ۔ جن کی وجہ سے سجع مذموم ہے ذاتی اسباب نہیں ہیں اور ایسی صورت میں سجع بذاتِ خود مذموم نہیں ہے ۔

لہٰذا سجع کا پُر تکلف استعمال (جس کی طرف چوتھے میں اشارہ کیا گیا ہے) ایک قابل مذمت عیب ہے ۔ اس میں معنی کے مقابلہ میں لفظ پر توجہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بعض عبارتیں گنجلک اور مبہم ہو جاتی ہیں یا بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور یہ پہلے عیب سے بھی زیادہ قبیح عیب ہے ۔

اسی طرح پانچویں نکتہ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ سجع کا اطلاق کبھی کبھی کہانت اور غیبی امور کی پیشین گوئی کرنے پر بھی ہوتا ہے جو شرعاً مذموم ہونے کے ساتھ ایک سنگین اور قابل مذمت عیب ہے ۔ لیکن یہ سارے عیوب ایسے نہیں ہیں جن سے کلام کا خالی ہونا ناممکن ہو، کیوں کہ ۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ۔ یہ اسباب ذاتی نہیں بلکہ عارضی ہیں ۔ چنانچہ پُر تکلف مسجع عبارت اور کہانت میں سجع کا استعمال مجرد سجع ہونے کی وجہ سے مذموم نہیں ہے بلکہ مذمت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں محض تکلف ہوتا ہے اور تکلف میں مبالغہ آرائی ہوتی ہے، یا اس وجہ سے کہ وہ کہانت میں استعمال ہوتی ہے ۔ لہٰذا ایسا استعمال جھوٹ، افترا اور دھوکہ پر مبنی ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسا عیب ہے جو کلام کے نظم و ترتیب اور فواصل کی مناسبت کے لوازم میں سے نہیں ہے اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں سجع کے وارد ہونے میں کونسی چیز مانع ہے؟ یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے جس میں بہت کچھ وزن ہے ۔ اس کے جواب کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم میں سجع کے وقوع یا عدم وقوع کے سلسلے میں کس موقف کو اختیار کیا جانا چاہیئے، چنانچہ چوتھے اور پانچویں نکتہ میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سجع کی مذمت مطلقاً اس کے سجع ہونے کی بنا پر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی مذمت کی اصل وجہ اس کا

کے متناسب فواصل سے جدا ہو جاتا ہے جس سے معاملہ واضح ہو جاتا، ابہام دور ہو جاتا اور الفاظ کو ان کے خاص معانی میں استعمال کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی۔

ہم جب خطباء اور انشاء پردازوں کے مسجع کلام کا مطالعہ کرتے ہیں، خواہ وہ کلام دورِ جاہلیت سے تعلق رکھتا ہو یا عہدِ اسلام سے یا اس کے بعد کے ادوار سے، نیز جب ہم اس میں اس کے فقرات کے اعتبار سے، اس کی تعداد اور فواصل کے پہلو سے، اُن فواصل باہم قریب یا بعد کے نقطۂ نظر سے اور ایک ہی کلام میں ان کے اتحاد و اختلاف کی جہت سے بحث کرتے ہیں تو ہم مندرجہ ذیل نتائج تک پہونچتے ہیں۔

۱۔ یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ مکمل خطبہ یا پورا کا پورا رسالہ ایک ہی فاصلہ پر ہو، بلکہ خطیب یا انشاء پرداز چند فقرات کو ایک معین فاصلہ پر استعمال کرنے کے بعد دوسرے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا تھا جو فقرات کے ایک اور مجموعہ پر مشتمل ہوتا تھا، پھر کبھی دوسرے فاصلہ سے تیسرے اور چوتھے فاصلہ کی طرف منتقل ہو جاتا تھا جو فقرات کے ایک اور مجموعہ پر مشتمل ہوتا تھا، پھر کبھی دوسرے فاصلہ سے تیسرے اور چوتھے فاصلہ کی طرف نکل پڑتا تھا اور ایسے ہی دوسرے فواصل کی طرف جیسا کہ مقام و محل کا تقاضا ہوتا۔

۲۔ دوسرے مجموعہ میں یا اس کے بعد والے مجموعہ میں لازم نہیں تھا کہ فقرات کی تعداد پہلے مجموعہ کے فقرات کی تعداد کے برابر ہو، چنانچہ کبھی تو اُس سے تعداد میں زائد ہوتے اور کبھی اس سے کم۔

۳۔ فقرات کے ہر مجموعہ کے فواصل عام طور پر ایک دوسرے سے متقارب ہوتے جب کہ وہ چھوٹے چھوٹے فقرات استعمال کرنا چاہتے، البتہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہر فقرے کے کلمات یا حروف ایک معیّن تعداد میں برابر ہوں، بلکہ یہ کافی تھا کہ تعداد کے اعتبار سے ان فقروں میں واضح فرق نہ ہو۔

۴۔ بعض وہ خطباء اور ادباء جو اپنے خطبوں اور تحریروں میں سجع کا بڑا اہتمام کرتے تھے عموماً اولیت سجع کو دیتے تھے اور رہا معنی تو وہ اُن کی نظر میں ثانوی درجہ رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی تو سجع سے شغف اور اس کے التزام میں وہ ایسے تکلفات پر مجبور ہوتے تھے کہ بعض فقروں کا مفہوم بالکل خبط یا بے تکا ہو کر رہ جاتا ہے جس کلام میں بھی معنی سے زیادہ لفظ پر توجہ دی جائے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ بہترین کلام وہ ہے جس میں لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ کبھی تو سجع کا خاص اطلاق موقع و محل کی دلالت اور قرینہ کی مدد سے کاہنوں کی من گھڑت غیب کی باتوں اور مستقبل کی پیشین گوئیوں پر ہوتا تھا جس کے ذریعہ وہ قضاء و قدر سے اسرار کی معرفت کا دعویٰ کرتے تھے اور اس غرض کے لیے دھوکہ بازی اور گمراہ کرنے کے سارے وسائل اختیار کرتے تھے اور اپنی مسجع عبارتوں کو ایہام و غموض سے پر کرتے تھے اور ایسے الفاظ کا استعمال کرتے جن کے اندر ایک سے زیادہ معنی کی گنجائش ہوتی ہے

آمَنَّا بِرَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی) اسی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ میں فواصل "الف" پر مبنی ہیں چنانچہ دوسری آیات میں جہاں فواصل "واو" اور "نون" "یا" "یا" اور "نون" پر مبنی ہیں وہاں پر موسیٰ علیہ السلام کو مقدم کیا گیا جیسا کہ ارشاد باری ہے: فَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ، اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔

قرآن میں سجع کے مؤیدین کی اس دلیل میں زور و قوت ہے اس دلیل کو مزید مستحکم کرنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں دسیوں مرتبہ "ارض و سماء" کا ذکر ایک ساتھ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں ہوا ہے اور ان تمام صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ "سماء یا سماوات" کا ذکر "ارض" پر مقدم ہے سوائے معدودے چند جگہوں کے جہاں پر "ارض" کا ذکر مقدم کیا گیا ہے اور یہ دو جگہیں ہیں جہاں پر یہ بالکل واضح ہے اور اس سے صرف فواصل کے تناسب کی رعایت مقصود ہے۔

اس کی مثال ارشاد ربانی ہے: تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی، اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی) کیوں کہ سورہ کے فواصل "الف" پر مبنی ہیں اور ان فواصل کے درمیان تناسب کا لحاظ کرتے ہوئے "ارض" و "سموات" پر مقدم کیا گیا جس کی صفت العلی ہے جو کہ الف کے اوپر تمام ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جہاں اس تناسب کی ضرورت باقی نہ رہی اور "ارض و سماء" کا ذکر دوسری مرتبہ فوراً بعد والی آیتوں میں ایک ساتھ آیا تو قرآن اپنے اصل کی طرف پلٹ آیا چنانچہ "سموات" کو "ارض" پر مقدم کیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے (لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی)

اسی کی دوسری مثال ارشاد باری ہے (رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ) چنانچہ یہاں پر لفظ "ارض" کو "سماء" پر مقدم کیا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں فاصلہ کا تناسب اُن دوسرے فواصل کے ساتھ مقصود ہے جو الف ممدودہ کے بعد ہمزہ پر مبنی ہیں۔

قاضی باقلانی کا جواب۔

قاضی ابوبکر باقلانی قرآن میں سجع کے مؤیدین کی سابقہ دلیل کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں "مؤیدین سجع نے تناسب فواصل کی خاطر لفظاً "موسیٰ و ہارون" کی تقدیم و تاخیر کی جو دلیل دی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ہمارے نزدیک مقصود وہ نہیں ہے جو انہوں نے ذکر کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ ایک ہی قصہ کا مختلف "الفاظ سے" جو کہ ایک ہی معنی ادا کریں، اس طرح دہرانا کہ فصاحت و بلاغت کا مکمل اظہار ہو بہت مشکل ہے۔ اسی وجہ سے بہت سارے واقعات مختلف مقامات پر جدا جدا ترتیبوں سے دہرائے گئے ہیں جس کے

ذریعہ ان مشرکین کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ وہ اس جیسا کلام وہ ایک مرتبہ بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں پھر متعدد پیرایوں میں اس کے بیان کا ذکر ہی کیا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ "نتیجۃً"، یہ ثابت ہوا کہ بعض کلمات کو بعض پر مقدم کرنے اور بعض کو بعض سے موخر کرنے کا مقصد اعجاز قرآنی کا اظہار ہے، سجع مقصود نہیں ہے جیسا کہ ان علماء نے سمجھا ہے۔

اس طرح قاضی ابوبکر باقلانی نے قرآن میں سجع کے مویدین کے قوی استدلال کو مسترد کرتے ہیں۔

قاضی باقلانی کا یہ موقف بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ وہ ان آیات میں جن میں "موسیٰ و ہارون" تقدیم و تاخیر کے ساتھ مذکور ہیں سجع یا تناسب فواصل کا انکار کرتے ہیں اور اس تقدیم و تاخیر کا مقصد محض اعجاز قرآنی بتلاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اظہار بلاغت کو ان آیات میں مقصود بنانا سجع یا تناسب فواصل کو مقصود بنانے کے منافی ہے؟

قرآن کی بلاغت اور اس کا ایک ہی بات کو ایک غرض سے مختلف پیرایوں میں بیان کرنے کا اعجاز ایک ایسا بدیہی امر ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جہاں "ہارون" کا ذکر "موسیٰ" پر مقدم ہوا ہے وہاں قرآن کا مقصود یہ ہے کہ آیت "الف" کے فاصلہ پر ختم ہو تاکہ بقیہ فواصل سے مناسبت پیدا ہو جائے، اور دوسری آیات میں جہاں "موسیٰ" کو "ہارون" پر مقدم کیا گیا ہے، وہاں مقصود یہ ہے کہ آیت دوسرے فواصل کی مناسبت سے "واو" اور "نون" کے فاصلہ پر ختم ہو۔

یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انکار مناسب نہیں اور اس صورت میں ان آیات میں اظہار بلاغت کو مقصود بنانے کے ساتھ ساتھ سجع یا تناسب فواصل کو بھی مقصود بنانے میں کوئی مانع نہیں ہے باقلانی کے برخلاف جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان آیات میں تقدیم و تاخیر کا واحد مقصد اظہار بلاغت ہے۔

یہ بات صحیح نہیں ہے چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تقدیم و تاخیر کا واحد مقصد سجع اور تناسب فواصل ہی ہے اب رہا اظہار بلاغت کا فائدہ جو ایک ہی معنی کو مختلف انداز بیان سے حاصل ہوتا ہے تو وہ اس پر مزید ہے۔ کیوں کہ اس بلاغت کا اظہار اس ترتیب کے علاوہ بھی جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے دوسری ترتیب میں بھی کیا جا سکتا تھا جیسے کہ ہارون اور موسیٰ کے نام اس ترتیب کے علاوہ کسی اور ترتیب سے بیان کیے جاتے جس طرح ان آیات میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ شعراء کی آیت میں ہارون کے ذکر کو موسیٰ کے ذکر پر مقدم کر دیا جاتا اس لیے کہ یہاں آیات "الف" اور "نون" کے فاصلہ پر ختم ہوتی ہیں اور اسی طرح "موسیٰ" کے ذکر کو "ہارون" پر سورہ "طٰہٰ" کی آیت میں مقدم کر دیا جاتا جس میں آیات

"الف" کے فاصلہ پر ختم ہوتی ہیں، اس ترتیب سے بھی غالباً بلاغت کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ تنویع جس کے بارے میں باقلانی کہتے ہیں کہ وہ بلاغت کی مظہر ہے وہ تو اس طرح کی تقدیم وتاخیر سے پوری ہو جاتی مگر اس کے بعد مقاطع کا حسن اور اسلوب کا جمال باقی نہ رہتا، لہٰذا جس تقدیم وتاخیر کے ساتھ قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں وہی کلام کے حسن وجمال کو اور اسلوب کی خوبصورتی ورعنائی کو برقرار رکھ سکتی ہے، لہٰذا صرف سجع یا تناسبِ فواصل۔ تعبیر کے اختلاف کے ساتھ ہی اس تقدیم وتاخیر سے مقصود ہے، چنانچہ "ہارون" اور "موسیٰ" کی آیات ہیں اور ایسے ہی "ارض" اور "سماء" کی آیات میں صرف سجع یا تناسبِ فواصل ہی مقصود ہے۔ اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں سجع یا تناسب فواصل کے مسئلہ میں قاضی باقلانی نے بڑا عجیب موقف اختیار کیا ہے۔ جس شدت سے وہ قرآن میں سجع یا تناسب فواصل کا انکار کرتے ہیں اس کی وضاحت مشکل ہے۔ ہمارا گمان ہے اور ہر گمان گناہ نہیں ہوتا کہ ان کے اس موقف کو اختیار کرنے کا اصل سبب مسلکی تعصب ہے کیوں کہ ان کے شیخ ابوالحسن اشعری کا یہی مسلک تھا چنانچہ وہ بھی اسی موقف پر مضبوطی سے جم گئے۔ شیخ کی طرف اس رائے کی نسبت شک وشبہ سے بالاتر ہے اور اس کی روایت خود باقلانی نے اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں کی ہے اور متعدد بار ذکر کیا ہے کہ شیخ اشعری قرآن میں سجع کے منکر ہیں اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی ان عقائدی وفلسفیانہ مسائل میں شمار ہوتا ہے جس میں اشاعرہ اور دوسروں کے مابین شدید اختلاف ہے۔

خلق قرآن

سجع کے انکار کے سلسلہ میں اشاعرہ نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطالعہ کرنے والا اگر ذرا سا بھی چوکے تو وہ مسئلہ خلق قرآن اور اس سے متعلق اختلافات میں الجھ جائے گا جو بہتوں کے لیے فتنہ اور بہتوں کے لیے ہلاکت کا باعث بنا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقوال سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ "کیا قرآن میں سجع کا استعمال جائز ہے۔ اس میں اختلاف ہے اور جمہور تین وجوہ سے اس کا انکار کرتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس کی اصل چڑیا کی مخصوص قسم کی آواز سے ہے (سجع الطیر) اور سجع قرآن اس سے بہت بلند وبرتر ہے کہ اس میں کسی چیز کے لیے ایسا لفظ مستعار لیا جائے جو اصلاً بے معنی ہو، دوسرے یہ کہ غیر اللہ کے کلام میں یہ صفت پائی جاتی ہے پس قرآن اس سے اعلیٰ واشرف ہے کہ اس میں اور مخلوق کے کلام میں کوئی چیز مشترک ہو۔ تیسرے یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات میں ہے پس اس کو ایسی صفت کے متصف کرنا جس کی اجازت نہیں دی گئی ہے جائز نہیں۔" یہ بعینہٖ اشاعرہ کے اقوال ہیں اور اپنے مفہوم ومدعا میں اس قدر واضح ہیں کہ کسی مزید تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس نقطہ نظر کو خود اپنے اصل وطن میں بھی حمایت اور غلبہ حاصل نہ ہو سکا اور یہی خلق قرآن کا موضوع ہے۔

سجع القرآن

ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قرآن میں سجع کے باب میں آخر علماء کے درمیان اختلاف رائے کیوں ہے اگر اصل مسائل اور ان کی حقیقت کے بارے میں انصاف اور اعتدال پسندی کے ساتھ غور و فکر کیا جائے تو سارے شبہات دور ہو جائیں گے اور تمام دشواریاں زائل ہو جائیں گی اور اس میں کسی معمولی اختلاف کی بھی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

اگر کلام میں سجع مقصود بالذات ہو پیچیدہ اور تکلف سے پر ہو، اس میں معنی سے زیادہ الفاظ پر توجہ دی جائے تو بلاشبہ ایسا مسجع کلام مذموم اور ناپسندیدہ ہوگا اور یہ ممکن نہیں کہ خداوند علیم و حکیم کے کلام میں ایسا نقص پایا جائے چنانچہ کتاب عزیز کے باب میں ایسی کسی چیز کا روا رکھنا ہرگز درست نہیں۔ البتہ اگر سجع سہل اور لطیف ہو نیز اس میں کلام کے معنی و مفہوم، اس کے روابط اور بلاغت کے مقتضیات کی پوری رعایت کی گئی ہو تو یقیناً ایسا مسجع کلام بہت ہی دلآویز اور دلکش ہوگا اور اس کے حسن و جمال اور لطافت کو بحث و جدال کا موضوع بنانا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوگا اور قرآن میں جو سجع ہے وہ تو یہی ہے۔ چنانچہ قرآن کا سجع اور فواصل کی ہم آہنگی تکلف اور پیچیدگی سے یکسر پاک ہے پھر قرآن میں سجع مقصود بالذات نہیں ہے جس کے لیے معنی اور مفہوم سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سجع کی رعایت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا معنی بعید الاحتمال ہو اور اس کی ادائیگی کے لیے کوئی دوسرا لفظ زیادہ مناسب اور صحیح ہوتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ قرآن میں سجع کی رعایت میں ایسے بے معنی اور مہمل الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو جن کی معنی مراد پر دلالت غیر واضح اور مبہم ہو۔ اس صورت حال میں قرآن کریم میں سجع کے وجود سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔

قرآن کریم کبھی تو عالم غیب کے بارے میں خبر دیتا ہے اور کبھی ان سربستہ امور کا پتہ دیتا ہے جن کے بارے میں جاننے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ یہ باتیں جن آیات اور فقروں میں بیان ہوتی ہیں جو مسجع بھی ہوتے ہیں اور غیر مسجع بھی۔ اس کے تمام بیانات کی خاص بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف حق اور صدق پر مبنی ہوتا ہے اس کو ماننا اور اس پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ اس میں شک کرنے والا مومن ہی نہیں ہو سکتا۔

سجع مذموم

رہا کاہنوں کا مسجع کلام تو وہ سجع مذموم ہے اس لیے کہ یہ تمام تر دھوکہ، فریب اور جھوٹ پر مشتمل ہوتا ہے اور غیب کے بارے میں جھوٹ موٹ کی خبریں دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے اور اس کے بارے میں سوا ان لوگوں کے جن کو بارگاہِ رب العزت سے منصب رسالت کے لیے چن لیا گیا ہے کسی اور کو کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی مسجع کلام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذمت فرمائی اور ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی فرمائی ہے جو اس سے تشبہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "أسجعاً كسجع الكهان؟"

یا یہ فرمایا " أسجاعة کسجاعة الجاهلية ؟ " اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا جو عاقلہ پر دیت کے وجوب کے باب میں اسلامی احکام سے روگردانی کر رہا تھا۔ معاملہ ایک عورت کا تھا جس نے ایک دوسری عورت پر زیادتی کی تھی جو حاملہ تھی اور نتیجہ کے طور پر اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ جب کہ اس نے کہا " كيف نفدي مَن لا شَرِبَ وَلا أكل، وَلا صاحَ فَاستَهَلَّ، أليس دمه قد يطل " ؟ یعنی بھلا ہم اس کا فدیہ کیسے ادا کریں جس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور نہ رو یا نہ آواز نکالی، پھر اس کا قصاص باطل نہیں ہو گیا۔ یہ اس نے اس وقت کہا جب کہ ایک عورت نے دوسری حاملہ عورت پر ظلم اور تجاوز کیا جس سے اس کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا "

سجع محبوب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً سجع کی مذمت نہیں کی ہے بلکہ آپ نے صرف اس سجع کی مذمت کی ہے جو کاہنوں اور اہل جاہلیت کے انداز اور طریقے پر ہو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کلام میں بعض جگہ نہایت لطیف اور دلآویز سجع کا استعمال فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے " أيها الناس، أفشوا الإسلام، واطعموا الطعام، وصلوا الأرحام، وصلوا بالليل والناس نيام، تدخلوا الجنة بسلام۔ "

اب کیا اس کے بعد بھی اشاعرہ اور غیر اشاعرہ کے مابین قرآن میں وقوع سجع کے باب میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سجع کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ دراصل قرآن کریم میں فواصل کے تناسب پر لفظ سجع کے اطلاق کو انتہائی غلط سمجھتے ہیں اس لیے کہ اس لفظ کا استعمال اکثر و بیشتر یا تو اس سجع پر ہوتا ہے جس میں غیر معمولی حد تک تکلف پایا جاتا ہے یا دھوکے باز اور جھوٹے کاہنوں کے سجع پر۔ چنانچہ اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مسئلہ سجع میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں ہے جو اختلاف بظاہر ہے بھی وہ صرف لفظی اختلاف ہے یعنی ایک لفظ کو چھوڑ کر دوسرا لفظ اختیار کرنے کا ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی

مؤتمر المصنفین کا سلسلہ مطبوعات (۲۱)
کتابت اور تدوین حدیث
تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی
مؤتمر المصنفین